ڈاکٹر محمد آصف اعوان

مغرب کے تہذیبی، سیاسی اور فکری پس منظر کا جائزہ

The study of cultural, political and intellectual side of western civilization reveals that the west has emerged out of a very humble and poor position to the present level. No doubt, intellectual efforts enlightened the west to an extent but the real hallmark in the development of western civilization, is industrial revolution in England. This article bring to light not only the factors of rapid economic and cultural growth in the west but also unveil those structural elements which will introduce the real face of the west.

عصر حاضر میں یورپی دنیا ترقی وعظمت کی علامت بن چکی ہے۔اس کی شان وشوکت اور چکاچوند ساری دنیا کے لیے باعثِ رشک ہے۔کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں جس میں مشرقی ممالک یورپ کی تقلید کرنا اپنے لیے باعثِ فخر نہیں سمجھتے۔سیاست و معاشرت،اور سائنس وتحقیق، ہر میدان میں مغربی مفکرین اور علما کی رائے ہمارے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے،تاہم سوال یہ ہے کہ کیا یورپ ہمیشہ سے ترقی وعظمت کی انہی بلندیوں پر فائز تھا؟ تاریخِ یورپ کا مطالعہ کریں تو حیرت واستعجاب سے انگشت بدنداں رہ جانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔تاریخ کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ یورپ جو آج سب کی آنکھ کا تارا ہے کبھی وحشت و بربریت، جہالت وافلاس، ظلم وتشدد اور ناشائستگی کا گہوارہ تھا۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی کتاب ''یورپ پر اسلام کے احسان'' میں ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب ''معرکہ مذہب وسائنس'' کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق بیاباں اور بے راہ جنگل تھا۔جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے۔ گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔چونکہ سڑکوں پر بے اندازہ کیچڑ ہوتا تھا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے رات کے وقت جو شخص گھر سے نکلتا وہ کیچڑ میں لت پت ہو جاتا۔تنگیٔ رہائش کا یہ عالم کہ گھر کے تمام آدمی اپنے مویشیوں سمیت ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔عوام ایک ہی لباس سالہا سال پہنتے تھے جسے دھوتے نہیں تھے.....لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بھی بکتا تھا اور فرانس کے ایک دریا ساون کے کنارے گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔امراء معدودے چند تھے جن کا کام زنا،شراب نوشی اور جوا تھا۔''(۱)

رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) اپنی کتاب "The Making of Humanity" میں لکھتا ہے:

> The mankind has been uplifted out of a past weltering with cruelty and injustice, a past in which four fifth of the population of Europe endured under the needs of their tormentors such

treatment as would today raise a storm of indignation, were it inflicted on dogs; when men in thousands were legally flayed, impaled, quartered, roasted, boiled; when London was called 'The city of gibbets'; when none but princes and priests had human rights; when the producers of food were made to pay for the right to use their implements; when the infamy of nameless justice was imperturbably rectified by Law, acquiesced in by literature, upheld by religion; when no murmur could be uttered against it save at the price of martyrdom.(۲)

یہاں تک کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی تک یورپ انتہائی نامساعد تہذیبی و معاشی حالات کا شکار رہا۔ ویلک-کے-فرگوسن اپنی کتاب "A Survey of European Civilization" میں رقم طراز ہے:

From England to Italy and from Prussia to Spain, in the seventeenth century three-fourths of the people led miserable lives without leisure or luxury. In the cities, most of the inhabitants subsisted on the verge of destitution, toiling as artisans or apprentices, as servants poorly paid and overworked, as porters or ostlers, linkboys or lackeys, peddlers or beggars.(۳)

رابرٹ بریفالٹ نے یورپ میں اٹھارویں صدی میں غلاموں کی خرید وفروخت کا ذکر کیا ہے اور ایشیا سٹریٹ اپنی تصنیف ''انگلستان'' میں رقم طراز ہے:

''اُنیسویں صدی کے شروع میں برطانوی سلطنت میں بہت سے غلام موجود تھے۔''(۴)

جان ولیم ڈریپر نے یورپ کی اخلاقی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے بڑھ کر یورپ کی تہذیبی بے راہروی پر کوئی اور تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے:

Social discipline was very far from being of that kind which we call moral. The master whipped his apprentice, the pedagogue his scholar, the husband his wife. Police punishments partook of the general brutality. It was a day for the rabble when a culprit was set in the pillory to be pelted with brickbats, rotten eggs and dead cats; when women were fastened by the legs in the stocks at the market place, or a pilferer flagged through the town at the cart-tail, a clamour not

unfrequently arising unless the lash were laid on hard enough to 'make him howl.(۵)

یہ تھی وہ سیاسی، تہذیبی، معاشی اور اخلاقی حالت جس میں یورپ صدیوں مبتلا رہا، تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یورپ نے موجودہ ترقی وعظمت کی طرف قدم کیسے اور کب اٹھایا؟ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق رقم طراز ہیں:

''یورپ صدیوں تک وحشت، بربریت اور تہ برتہ جہالت میں گرفتار رہا۔ وہاں تہذیب واخلاق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان سپین پہنچے اور سو سال بعد سسلی میں وارد ہوئے۔ یہ اپنے ساتھ تاریخ، فلسفہ، طبیعات، طب، ریاضی، شعروادب، علم الکلام اور دیگر درجنوں علوم لے کر آ گئے۔ رفتہ رفتہ یہ علوم اٹلی، جرمنی، فرانس اور دیگر ممالک میں پہنچے اور بارھویں صدی میں یورپ مائل بہ علم ہو گیا۔ یہ شوق بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ سولہویں صدی میں ایک عام بیداری پیدا ہو گئی، جسے یورپ میں حیاتِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔''(۶)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کہتے ہیں:

''مغربی تہذیب اسلامی تہذیب اور اس کے اُن عربی مراکز کے ساتھ مغرب کے اتصال سے وجود میں آئی ہے جو اسپین یا دوسرے بلادِ اسلامیہ میں قائم ہوئے تھے۔''(۷)

عنایت اللہ سبحانی اصلاحی اپنی کتاب ''مجاہد کی اذان'' میں رقم طراز ہیں:

''یورپین قومیں جو مشرق میں صلیبی جنگوں اور مغرب میں اُندلس کے عرب مسلمانوں کی ہمسائیگی واختلاط سے اسلام واقوام اسلام سے قریب رہیں، اُنہوں نے اس قرب واتصال سے محض قومی شعور اور سیاسی یکجہتی کا ہی درس نہیں لیا، ذہنی بیداری اور زبردست عقلیت کا بھی فائدہ حاصل کیا۔ اُنہوں نے بہت سے علوم سیکھے اور اُن کے اندر ایک نہایت وسیع علمی وادبی ترقی کی صحیح نمودار ہوئی۔''(۸)

مشہور مورخ اے۔ جے۔ گرانٹ لکھتا ہے:

''یورپ کی تاریخ میں ہسپانی مسلمانوں کے تمدن کی تباہی سے دردناک کوئی واقعہ نہیں ہے کیونکہ اُنہوں نے یورپ کے تمدن میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے اور اگر تباہ نہ ہوتے تو اس میں اور اضافہ کرتے۔''(۹)

رابرٹ بریفالٹ "The Making of Humanity" میں لکھتا ہے:

The Arabs introduced three inventions into Europe, each of which was to bring about a world-transforming revolution. the mariner's compass which was to expand Europe to the ends of the earth; gunpowder which was to bring to an end the supremacy of the armoured knight; and paper which prepared the way for the printing press.(۱۰)

جس زمانے میں یورپ تاریکی کے دور (Dark Ages) میں سے گزر رہا تھا، ایشیائی ممالک خاص طور پر مسلمان ممالک تہذیب وتمدن کی بامِ عروج پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

Western civilization was not infact the best in existance at that time; both the Mohammadan and the Chines were superior to

the West.(۱۱)

مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز سولہویں صدی عیسوی میں ہوا۔اس سے پہلے مغرب میں پاپائیت کا غلبہ تھا۔لوگ مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور کلیسا کی ہر طرف اجارہ داری تھی۔سولہویں صدی عقل وفکر کی برتری،فطرت کے مشاہدے اور تجربہ و تحقیق کا دور ہے۔اس دور میں سائنس کے میدان میں بعض ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے کلیسائے روم کے متکلمانہ افکار و نظریات کا طلسم توڑ ڈالا،اور انسان کو خرافات پر یقین کرنے کی بجائے تحقیق و تجربہ سے فطرت کے حقائق کی جستجو کرنے کی جانب متوجہ کیا۔اہل کلیسا کے لیے نئے نظریات،کلیسائی پروہتوں کی لوگوں پر گرفت اور اقتدار کے لیے بہت بڑا خطرہ تھے۔ثاقب رزمی اپنی کتاب ''سائنسی فکر اور ہمعصر زندگی'' میں لکھتے ہیں:

''جب یورپ صدیوں کی جہالت کی نیند سے بیدار ہوا تو اُس نے استقرائی طریقِ فکر اور عملی تجربہ کو اپنایا،لیکن مسیحی کلیسا نے دخل اندازی کی کیونکہ وہ بجائے خود ایک سلطنت بن چکا تھا۔''(۱۲)

فکرِ نو کے اس سیلانی ریلے کو روکنے کے لیے:

''کلیسائی پروہتوں نے اٹلی،فرانس،جرمنی اور سپین میں کلیسائی احتسابی عدالتیں (Inquisitions) قائم کر دیں اور آزاد خیال لوگوں اور مفکروں کو زندہ جلانا یا تختہ دار پر لٹکانا شروع کر دیا۔''(۱۳)

ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

It is estimated that between 1481 and 1801 the inquisition punished three hundred and forty thousand persons, nearly thirty two thousand of them were burnt alive, including the great scientist, Bruno, whose only crime was that he taught the plurality of the worlds. Galileo another scientist of no less worth, was remorselessly punished till he died in prison for having held, contrary to the 'scriptures', that the earth moved round the sun.(۱۴)

اہل کلیسا کی ان تمام کوششوں اور ظلم و تشدد کے باوجود فکرِ تازہ کے آگے کوئی بند نہ باندھا جا سکا،اور کاپرنیکس (Copernicus ۱۴۷۳ء-۱۵۴۳ء)،کیپلر (Kepler ۱۵۷۱ء-۱۶۳۰ء) اور گلیلیو (Galileo ۱۵۶۴ء-۱۶۴۲ء) نے بعض ایسے سائنسی حقائق دریافت کیے جو براہ راست مذہبی پروہتوں کے توہمات سے متصادم تھے۔کاپرنیکس سے قبل چرچ کی جانب سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ تھا کہ زمین جامد ہے اور سورج کے گرد گردش نہیں کرتی۔اس نظریے کو (Geocentric Theory) کہتے ہیں،لیکن کاپرنیکس (Copernicus) نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ زمین گردش میں ہے اور سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے:

To the earth, Copernicus, attributed a tripple motion,.....a daily rotation on her axis, an annual motion, round the sun, a motion of declination of the axis.(۱۵)

کاپرنیکس (Copernicus) کے بعد کیپلر (Kepler) نے بھی اسی نظریے کی تائید کی،برٹرینڈ رسل اپنی تصنیف "History of Western Philosophy" میں رقم طراز ہے:

He (Kepler) was the first important astronomer after Copernicus to adopt the heliocentric theory--Kepler's great achievement was the discovery of his three laws of planetary motion.(۱۶)

جب گلیلیو (Galileo) نے دوربین ایجاد کی تو اس سے مشاہدات کے ذریعے کاپرنیکس اور کیپلر کے نظریات کے حتمی ثبوت فراہم ہو گئے لیکن:

Religious people resented the new theory, not only because it seemed contrary to the teaching of the Bible and the tradition of the church, but also because it removed the earth from the centre of the Universe, the place proper for it as the stage on which was enacted the divine drama of man's creation, fall and redemption.(۱۷)

گلیلیو (Galileo) نے اپنی کتاب سائیڈیول مسنجر (Sidevial Massenger) میں اپنے دور کے لیے نہایت حیرت انگیز انکشافات کیے۔ جان ہرمل اینڈل جونیئر اپنی کتاب ''ذہنِ انسانی کا ارتقا'' میں لکھتا ہے:

''اُس (گلیلیو) نے مشتری کے چار چاند دریافت کیے جو اُسی طرح اس کے گرد گھوم رہے تھے جیسے ہمارا چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اس نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ زہرہ چاند کی طرح مختلف ہیتوں سے گزرتی ہے لہٰذا وہ بھی زمین کی طرح تاریک جرم ہونا چاہئے جو سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔''(۱۸)

گلیلیو (Galileo) فطرت سے اس قدر دلچسپی رکھتا تھا کہ اُس نے یہ مشورہ دیا کہ مقدس مذہبی کتاب انجیل کو فطرت کی روشنی میں پڑھنا چاہئے۔ اس دور کا ایک اور بڑا نام انگریز مفکر فرانسس بیکن (Francis Bacon ۱۵۶۱ء-۱۶۲۶ء) کا ہے۔ بیکن (Bacon) عقل و خرد کا زبردست حامی اور مداح تھا۔ اپنی تصنیف ''توصیف علم'' (۱۵۹۲) میں لکھتا ہے:

''کیا عقل کی لذّات، جزیات و تاثرات کی لذّات سے بہتر نہیں۔ کیا یہی وہ سچی اور قدرتی لذت نہیں ہے جس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ کیا علم ہی نہیں جو ذہن کو اضطراب سے نجات بخشتا ہے۔''(۱۹)

بیکن (Bacon) کا خیال ہے کہ آخرت گو حقیقی سہی تاہم فطرت اور دنیا جو ہمارے سامنے ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کا مطالعہ کرنا، اسے تسخیر کرنا اور پھر اس سے مکمل استفادہ کرنا بہت ضروری ہے۔ فرانسس بیکن (Francis Bacon) کے نزدیک علم ہی وہ قوت ہے جس کی مدد سے انسان فطرت پر حاوی ہو سکتا ہے اور اس کے خزائن سے استفادہ کر سکتا ہے۔ برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

The whole basis of his philosophy was practical: To give mankind mastery over the forces of nature by means of scientific discoveries and inventions.(۲۰)

یہ زمانہ یورپ میں بہت سرگرمی اور عقلی و فکری کاوش کا دور ہے۔ اس دور میں کلیسا کو شکست ہوئی، بادشاہ مطلق العنان بن بیٹھے، قومی ریاست کی بنیاد پڑی، تجارت کا آغاز ہوا، بحری راستوں کے ذریعے نو آبادیات کی دریافت ہوئی۔ سائنس کے

میدان میں کاپرنیکس (Copernicus)، کیپلر (Kepler) اور گلیلیو (Galileo) نے روایتی مذہبی علوم اور خیالات کو یکسر فرسودہ قرار دے دیا۔ تخیلی صداقت اور حقیقت کے تصور کو مسترد کر دیا۔ فلسفۂ تشکیک کو عروج حاصل ہوا، اور ہر خیال کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ فرانس میں اس فلسفہ کا علمبردار مون ٹین (Montaigne ۱۵۳۳ء-۱۵۹۲ء) ہے، لیکن جہاں ایک طرف عقل و سائنس اور فلسفۂ تشکیک کے علمبردار نئے نئے خیالات پیش کر رہے تھے جس کے طفیل یورپ میں نشاۃ ثانیہ یا جدیدیت کا آغاز ہوا تو دوسری طرف دین و مذہب کے پاسدار تخیلی تصورات اور صداقت کے ساتھ اصلاحِ دین کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس دور کے یورپ میں یہ دونوں تحریکیں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) اور اصلاحِ دین (Reformation) ایک ساتھ سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں۔ اصلاحِ دین کی تحریک میں فرقہ پروٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر (Martin Luther ۱۴۱۳ء-۱۵۴۶ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔

اصلاحِ دین کی تحریک دراصل ایک احتجاجی ردِعمل تھا اُس مذہبی ٹھیکیداری اور اجارہ داری کے خلاف جس نے پورے یورپ کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اگرچہ اصلاحِ دین کی تحریک میں مارٹن لوتھر (Martin Luther) کا نام سب سے نمایاں ہے تاہم لوتھر سے بھی پہلے ایک شخص ایرسمس (Erasmus) نے کلیسا کی خرابیوں کو بے نقاب کیا اور ایک کتاب ''حماقت کی تعریف'' (In Praise of Folly) لکھی جس میں کلیسائی نظام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ برٹرنڈ رسل اپنی کتاب میں "In Praise of Folly" کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کتاب میں:

> Pardons and indulgences, by which priests "compute the time of each soul's residence in purgatory" the worship of saints, even of the virgins, "whose blind devotees think it manners to place the mother before the son" the disputes of theologians as to the Trinity and the Incarnation; the doctrine of transubstantiation; the scholastic sects; pops, cardinals and bishops--all are fiercely ridiculed.Particularly fierce is the attack on the monadistic orders; they are "braenrick fools" who have very little religion is them, yet are" highly in love with themselves,and fond admirers of their own happiness." (۲۱)

مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے پاپائے روم کی برتری اور پورے یورپ کے لیے مشترک چرچ اور پوپ کے وجود سے انکار کیا۔ ایڈون اے۔ برٹ اپنی کتاب ''فلسفہ مذہب'' میں لکھتا ہے کہ:

> ''سب سے نمایاں پابندی جس سے اُس نے آزادی حاصل کی وہ کیتھولک کلیسا کے اقتدار کی پابندی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہر عیسائی کو ایسی آزادی حاصل کرنے کا حق ہے۔ لوتھر کی اس تعلیم کے باعث کیتھولک فرقے کی سماجی قوت ختم ہونی شروع ہوئی۔ اُس نے شمالی یورپ کے ہزاروں آدمیوں اور عورتوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ کلیسا کی رسوم اور اُس کی حاکمیت کو تسلیم کیے بغیر بھی اُخروی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔'' (۲۲)

اصلاحِ دین کی تحریک ایک ایسے دور میں شروع ہوئی جب یورپ زوال اور جہالت کے سایوں سے نکل کر تحقیق و جستجو کی منزلیں سر کر رہا تھا اور سائنسی طرزِ عمل اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر اس تحریک کے بہت دور رس اور مفید نتائج برآمد ہوئے۔

سترہویں صدی تک یورپی دنیا نے یہ طے کرلیا کہ عقل ہی تمام مسائل کا حل ہے اور اس کو استعمال کیے بغیر مادی کائنات کی تسخیر ناممکن ہے چنانچہ اس دور میں وہ تمام عقائد و مسائل جن کی عقلی و فکری توجیہہ ممکن نہ تھی، ان کی تجسیم کرنے کی کوشش کی گئی یا پھر ان کا انکار کیا گیا۔ Ferdinand Schevill اپنی کتاب "A History of Europe" میں رقم طراز ہے:

> Before the eighteenth century was far on its way, the passion for knowledge of the world of nature in which the life of man is set, had become so general that literary popularizers undertook to purvey the new discoveries on the general public. It was in this manner that at least for an upper stratum of Europeans, science became a veritable religious faith which gradually superseeded the faith embodied in the various Christian churches.(۲۳)

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں عقلیت کے دو بڑے پرستار پیدا ہوئے جنہوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی بلکہ آئندہ تمام ادوار کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ان میں سے ایک فرانس کے فلسفی اور ریاضی دان دیکارت (Rene Descartes ۱۵۹۴ء-۱۶۵۰ء) اور دوسرے انگلستان کے سائنس دان نیوٹن (Isaac Newton ۱۶۴۲ء-۱۷۲۷ء) ہیں۔

دیکارت (Descartes) کو فرانس میں دین و مروت کا سب سے بڑا دشمن اور خدا کا حریف قرار دیا جاتا ہے۔ جان ہرمل رینڈل رقم طراز ہے:

> ''دیکارت نے فطرت کو ایک مشین اور محض مشین بنا دیا تھا۔ مقاصد اور روحانی اہمیت اس میں سے خارج کیے جا چکے تھے..... اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وسعت اور حرکت میرے حوالے کر دو تو میں ایک کائنات بنا دوں گا۔''(۲۴)

دیکارت (Descartes) نے روح اور مادہ کے حقیقی اور غیر حقیقی ہونے سے متعلق پرانی نزاعی بحث کو یہ کہہ کر طے کیا کہ روح اور مادہ دونوں حقیقی ہیں اور اپنی اپنی جگہ قائم اور خود مختار ہیں۔ گویا دیکارت (Descartes) نے انسان کی روح اور جسم کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا، لیکن روح کیا ہے؟ اس سوال کا جواب نہ تو دیکارت (Descartes) دے سکا اور نہ مغربی دنیا کا کوئی اور عقلیت پرست۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب روح کے مسئلے پر عجیب تخمسے اور تضادات کا شکار ہو گیا۔ یہاں تک کہ بعض اہلِ عقل نے ''ذہن'' کو ہی روح سمجھ لیا۔ کیونکہ:

''خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر''(۲۵)

وجود کی تعریف سے متعلق دیکارت (Descartes) کا ایک لاطینی جملہ بہت مشہور ہوا کہ:

Cogito Ergo Sum(۲۶)

یعنی میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔ دیکارت (Descartes) کہتا ہے کہ:

> I think therefore, I am, was so solid and so certain that all the most extravagant suppositions of the skeptics were incapable of upsetting it, I judged that I could receive it without scruple

as the first principle of the philosophy that I sought.(۲۷)

دیکارت (Descartes) کے اس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل لکھتا ہے کہ:

If I ceased to think, there would be no evidence of my existence.(۲۸)

گویا دیکارت (Descartes) کے نزدیک تفکر کی صلاحیت سے ہی وجود کی شہادت ملتی ہے۔ دیکارت کے ان خیالات پر بہت زیادہ تنقید بھی ہوئی، ایک مرتبہ دیکارت کے ایک دوست نے اُس سے پوچھا کہ:

''میرے کتے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔''(۲۹)

غرض دیکارت (Descartes) کے خیالات نے پہلے سے موجود فکری کشمکش میں مزید اضافہ کر دیا۔ دیکارت (Descartes) کے ایک ہمعصر پاسکال (Pascal) نے انسان کو (Thinking Reed) قرار دیا۔ Reed کا لفظ پاسکال کی انسان سے شدید نفرت اور حقارت کا آئینہ دار ہے۔ پاسکال (Pascal) نے عقل کے مقابلے میں ''دل'' کو لا کھڑا کیا اور کہا:

The heart has reasons of its own which the reason does not understand.(۳۰)

پاسکال (Pascal) کے قلم سے ''ہارٹ'' یا دل کا لفظ، کس معنی و مفہوم کے ساتھ نمودار ہوا، اس کے بارے محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''پاسکال نے جس دل کا ذکر کیا ہے اور جسے ذہن کے مقابل کھڑا کیا ہے، اس سے مراد ''جذبات'' ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پاسکال نے دل اور عقل یا ذہن کے درمیان جنگ چھیڑ دی۔''(۳۱)

اس جنگ کے نتیجے میں مغرب ایک نئے کرب کا شکار ہو گیا جو کہ عقلیت پرستی کا نتیجہ تھا۔

۱۶۴۲ء گلیلیو (Galileo) کا سنِ وفات اور نیوٹن (Newton) کا سنِ پیدائش ہے۔ گویا ایک عظیم انسان اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور دوسرے نے جنم لیا۔ گلیلیو نے مشاہدہ فطرت اور تسخیر کائنات کا کام جہاں چھوڑا تھا، نیوٹن نے اسے آگے بڑھایا۔ سائنس کی دنیا میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ قانون کششِ ثقل (Law of Gravitation) ہے۔ کوئی بھی باشعور اور اسرارِ فطرت کا راز داں انسان نیوٹن کے اس قانونِ کششِ ثقل کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ بقول رابرٹ بی۔ ڈاونز:

''نیوٹن نے خود اعتراف کیا کہ اُس نے میکانکی اُصول پر جو نظامِ عالم مرتب کیا وہ کاپرنیکس کے شروع کیے ہوئے کام پر مبنی تھا، جسے کیپلر اور گلیلیو نے اعلیٰ پیمانہ پر جاری رکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اگر دوسروں سے آگے نکل گیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ میرے پاؤں ان دیو پیکر انسانوں کے کندھوں پر تھے۔''(۳۲)

تاہم نیوٹن (Newton) کی سائنسی تحقیقات شاندار علمی کارنامہ ہیں۔ نیوٹن (Newton) کا خیال تھا کہ یہ کائنات چند واضح قوانین کے ماتحت ہے۔ اس کی مثال ایک بہت بڑی مشین کی سی ہے جس کا ہر حصہ اور پرزہ چند بنیادی قوانین کے مطابق متحرک ہے۔ نیوٹن کہتا ہے کہ:

''میرے پاس یہ اندازہ کرنے کے بہت سے وجوہ موجود ہیں کہ فطرت کے تمام مظاہر خاص قوتوں پر منحصر ہیں جن کی وجہ سے جسموں کے ذرات بعض غیر معلوم اسباب کی بنا پر یا تو ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں یا ایک دوسرے سے دور بھاگتے اور پیچھے ہٹتے ہیں۔''(۳۳)

نیوٹن (Newton) کا قانون کششِ ثقل (Law of Gravitation) سائنس کی دنیا میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن نیوٹن (Newton) اپنی بے انتہا عقل و دانش اور فکر و فہم کے باوجود یہ بتانے سے قاصر رہا کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں اور کس کے پیدا کیے ہوئے ہیں جو مظاہرِ فطرت میں ایک خاص ربط و نظم اور توازن رکھے ہوئے ہیں۔ سورج، چاند، ستاروں اور زمین کی گردش اور حرکت کس کے حکم پر ہے۔ یہ سارا نظام کیسے وجود میں آیا اور کون سی مخفی طاقت اس کو کنٹرول کیے ہوئے ہے۔ نیوٹن (Newton) کی عقلی مساعی اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے کہ:

> The theory of gravitation, as delivered by Newton, thus leads us to a knowledge of the mathematical construction of the solar system and inferentially likewise of that of other systems; but it leaves without explanation a large number of singular facts. It explains the existing conditions of equilibrium of the heavenly bodies, but tells us nothing of their genesis.(۳۴)

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کی رسائی محض اُن مظاہر تک ہے جو وجود رکھتے ہیں اور نظر آتے ہیں لیکن ان مظاہر کا خالق و مالک کون ہے اس کا جواب عقل نہیں دے سکتی کیونکہ عقل کے نزدیک تو بقول دیکارت (Descartes) صرف وہی وجود حقیقت ہے جو واضح ہو اور قابلِ مشاہدہ ہو۔ بقول دیکارت (Descartes):

> All things that we conceive very clearly and very distinctly are true.(۳۵)

''مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر''(۳۶)

یہی وہ مقام ہے جہاں کفر و ایمان کے درمیان حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے۔ یورپ نے جب نشاۃ ثانیہ کی جانب قدم بڑھایا تو اس پر علم و دانش کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ خوب عقل و فکر کے گھوڑے دوڑائے گئے۔ کاپرنیکس (Copernicus)، کیپلر (Kepler)، گلیلیو (Galileo) اور نیوٹن (Newton) جیسے عظیم المرتبت سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے افکارِ نو کے انبار لگا دیئے۔ انسان کو کائنات میں اُس کے صحیح مقام و مرتبے سے روشناس کرایا۔ صدیوں سے پاپائیت کے جبر و استحصال، جاہلانہ رسوم و قیود کے پابند اور غلامی و ذلت میں پڑے ہوئے انسان کو بے جا پابندیوں اور خرافات سے نجات دلائی۔ یورپ میں اس ساری تبدیلی کے عمل میں عقل و خرد اور تحقیق و اختراع نے بنیادی کردار ادا کیا، لیکن جہاں ایک جانب عقل و دانش کی جیت ہوئی تو دوسری طرف اس پر حد سے زیادہ انحصار اور اعتماد کی وجہ سے دلوں سے نورِ ایمان کافور ہو گیا۔ لادینیت اور سیکولر طرزِ فکر عام ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

> The humanism of Renaissance gave a new impetus to the perusal of the only secular literature then existing, and thus helped to establish the dominion of secular thought in the modern world.(۳۷)

یہاں تک کہ مارٹن لوتھر (Martin Luther) مذہب کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ معاشرتی و سیاسی مسائل میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اجتماعی اخلاق کی اصلاح ہو سکے۔ ایچ۔او۔ ویلکمن اپنی تصنیف ''عروج فرانس'' میں رقم

طراز ہے:

''مذہب کا معاشرت میں اتنا دخل تھا کہ مذہب میں کسی قسم کا خلل لازماً معاشرتی و سیاسی حالت میں بھی خلل انداز ہوتا تھا اور لوتھر اس سے بہت بچنا چاہتا تھا۔''(۳۸)

کاروبارِ حیات میں مذہب کو ثانوی حیثیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فکر و عمل سے اخلاقی پہلو غائب ہو گیا بلکہ بعض لوگوں نے اپنے مفادات کے پیشِ نظر اخلاقیات کے نئے معیار مقرر کر لیے مثلاً اُنہوں نے کہا کہ طاقت حاصل کرنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ جو طاقتور ہے وہی اچھا ہے اور طاقت حاصل کرنے کے لیے چالبازی، دغا اور فریب سب سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور کا سب سے بڑا سیاسی مفکر میکیاولی (Wiecolo Machiavelli ۱۴۶۹ء-۱۵۲۷ء) اپنی کتاب ''بادشاہ'' (The Prince) میں لکھتا ہے:

''جب کوئی غاصب کسی مملکت پر قبضہ کر لے تو اُسے یہ طے کرنا چاہئے کہ کون کون سے مظالم ناگزیر ہیں۔ اُسے چاہئے کہ جو ظلم کرنا ہو بس ایک دفعہ کر ڈالے تا کہ بار بار اس کی ضرورت نہ پیش آئے۔''(۳۹)

میکیاولی (Machiavelli) اپنی کتاب میں ایک اور جگہ رقم طراز ہے:

''جب کوئی بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ ہو اور اُس کے ماتحت بہت سے سپاہی ہوں تو اُسے سنگدلی کے الزام کی ذرا پرواہ نہ کرنی چاہئے، اس لیے کہ بغیر اس قسم کی شہرت کے کوئی سردار اپنی فوج کو نہ تو متحد رکھ سکتا ہے اور نہ فرائضِ احساس اُن میں جاگزیں کر سکتا ہے۔''(۴۰)

یوں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ نشاۃ ثانیہ کی بہار کی آمد کے ساتھ علم و دانش کے پودے کو تحقیق و اختراع اور تلاش و جستجو کے عمل نے جو پانی دیا، اس کا ثمر روحانی قدروں سے انکار اور مذہب سے بیزار مادی طرزِ فکر کی صورت میں ہاتھ آیا۔

انقلابِ فرانس

انقلابِ فرانس تاریخ میں بنیادی انسانی حقوق کی علمبرداری اور پاس داری کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس انقلاب کا بنیادی نعرہ آزادی، مساوات اور اخوت تھا۔ صدیوں سے ظلم و جبر اور استحصال کا شکار عوام جب یک دل و یک آواز ہو کر اپنے حقوق کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تو ایوانِ اقتدار کے در و دیوار لرز اُٹھے۔ عوامی طاقت نے جب ایک زبردست طوفان کی صورت میں ظالموں کا گھیراؤ کیا تو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

انقلابِ فرانس کے حقیقی محرکات کا اندازہ فرانس کے علمی، سماجی اور سیاسی حالات کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں فرانسیسی حکما اور مفکرین نے اہم کردار ادا کیا۔ فرانس زمانۂ قدیم سے ہی یورپ میں علمی و ادبی اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ فرانسیسی زبان و ادب سے بیشتر یورپی ممالک نے استفادہ کیا۔ رگوبیر (Raghubir) اپنی کتاب "Modern European History" میں رقم طراز ہے:

France was the intellectual and cultural centre of Europe. French language, literature, drama, art, manners and her form of government were models for the rest of Europe. To be called "civilized" one had to know the French language and culture.(۴۱)

جہاں تک انقلابِ فرانس کے سماجی محرکات کا تعلق ہے۔ اس ضمن میں اکثر مؤرخین نے اس اعتبار سے مبالغہ سے کام لیا ہے کہ اُنہوں نے صرف فرانس کے سیاسی و سماجی حالات کو ہی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ سیاسی اور سماجی

حالات کی ابتری انقلاب کی طلب گار تھی تاہم انقلاب کا اصل محرک اُس دور کی علمی وفکری رہنمائی تھی۔ ولیم ورڈزورتھ (William Wordsworth ۱۷۷۰ء-۱۸۵۰ء) اپنی نظم "The French Revolution" میں کہتا ہے:

Oh! Times,

In which the meagre, stales forbidding ways.
Of custom, law and statute, look at once.
The attraction of a country in romance,
When reason seemed the most to assert her rights,
When most intent on making of herself,
A prime enchantress--to assist the work,
which then was going forward in her name!(۴۲)

اگر محض سیاسی اور سماجی حالات کو ہی نظر میں رکھا جائے تو اس اعتبار سے تو سارا یورپ ایک ہی جیسے حالات کا شکار تھا بلکہ دیگر یورپی ممالک تو فرانس سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ بقول رگوبیر:

It was not only in France that political power was denied to the masses, the political, social, and economic condition, all over Europe, were more or less the same.(۴۳)

بلکہ وی۔ ڈی۔ مہاجن تو یہاں تک لکھتا ہے کہ:

Condition of the peasants of France was better than those of Germany, Spain, Russia and Poland.(۴۴)

دراصل فرانس میں انقلاب متوسط طبقے کے لوگوں کی وجہ سے رونما ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مسائل کا ادراک رکھنے کے ساتھ ساتھ علم وفکر کی روشنی سے مستفید تھے اور اس قابل تھے کہ استحصالی قوتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ دوسرے یورپی ممالک اور فرانس میں یہی ایک فرق تھا جس کی وجہ سے یہ عظیم انقلاب فرانس میں رونما ہوا۔ مہاجن رقم طراز ہے:

There existed in France an enlightened middle-class which was not to be found in other parts of Europe--They were profoundly influenced by the philosophy of Rousseau, Voltaire and Montesquieu.(۴۵)

روسو (Rousseau ۱۷۱۲ء-۱۷۷۸ء)، والٹیئر (Voltaire ۱۶۹۶ء-۱۷۷۸ء) اور مانٹسکیو انقلابِ فرانس کے وہ فکری رہنما تھے جن کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز رہی کہ کسی طرح ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جو انقلاب کے لیے انتہائی سازگار ہو۔ ڈی۔ جی شارلٹن اپنی تصنیف "France" میں لکھتا ہے:

The responsibility of the philosophers for the revolution, then, was probably restricted to creating the climate of opinion which made revolution possible.(۴۶)

انقلابِ فرانس ایک ایسی عظیم جدوجہد تھی جس نے نہ صرف فرانس بلکہ پورے یورپ پر نہایت گہرے اور دُوررس

اثرات مرتب کیے۔فرانس اور دیگر یورپی ممالک میں مطلق العنانی طرزِ حکومت ختم کرنے، انسانیت کو آزادی اور مساوات کے حقوق دلانے، معاشی استحصال سے نجات دلانے اور جمہوری طرزِ فکر عام کرنے میں اس انقلاب نے اہم کردار ادا کیا۔اگرچہ انقلابِ فرانس کے باعث سیاسی اور سماجی سطح پر تمام یورپی ممالک میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں تاہم علمی وفکری سطح پر انقلابِ فرانس کے بعد جن تین طرزہائے فکر کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا، ان کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔

جمہوریت (Democracy)

قوم پرستی (Nationalism)

افادیت پرستی(Utilitarianism)

انقلابِ فرانس کا مغرب کے لیے سب سے بڑا تحفہ یہ تین نظریات تھے جن پر آج تک ساری مغربی دنیا نہایت سختی سے کاربند ہے۔

جمہوریت (Democracy):

انقلاب کے بعد سلطانیٔ جمہور کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔قانون کی بالادستی ہوئی اور منتخب شدہ اسمبلیوں کو قانون سازی کے اختیارات دیئے گئے۔بادشاہ کی بجائے عوام کو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک قرار دیا گیا۔عوامی حکومت کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔انقلاب کے بعد نپولین (Napoleon ۱۷۶۹ء-۱۸۲۱ء) برسرِ اقتدار آیا تو اُسے بھی عوام کی حمایت کا ووٹ حاصل کرنا پڑا۔وی۔ڈی مہاجن کے مطابق:

> The French revolution asserted that the people should rule themselves and the government should be not only "for the people" but also "by the people.(۴۷)

چنانچہ جمہوریت کو پورے یورپ میں ''آزادی کی نیلم پری'' تصور کیا جانے لگا۔آج تک یورپ اس طرزِ حکومت کو مثالی قرار دیتا ہے لیکن اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ مغربی طرزِ جمہوریت مغرب کے لادینی ذہن اور سطحی طرزِ فکر کا شاخسانہ ہے۔جب مغرب کو خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین نہ رہا تو اقتدارِ اعلیٰ خدا کی مخلوق کے ساتھ منسوب کر دیا گیا اور اصلاح کے جوش میں خود ساختہ مساوات کے تصور کو اپناتے ہوئے بلا لحاظ عقل و دانش اور علمی وفکری مرتبے کے سب انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑے کرتے ہوئے سب کی رائے کو انتخابِ حکومت اور حکومتی اُمور میں برابر قرار دیا گیا۔اب چاہے کوئی فاتر العقل، جاہل اور غنڈہ ہو یا انتہائی ذہین وفطین، سنجیدہ سوچ اور قومی درد رکھنے والا پڑھا لکھا اور باشعور انسان، ''عدل جمہوریت'' ان میں کوئی فرق نہیں کرتا اور بہت ممکن ہے کہ کسی انتہائی اہم اَمر کا فیصلہ محض ایک جاہل انسان کے تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہو جائے جس پر بعد میں قوم کو صدیوں پچھتانا پڑے۔یہی وجہ ہے کہ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ:

> Democracy is the worst form of government. It is the most inefficient, the most clumsy, the most unpractical. No machinery has yet been contrived to carry out in any but the most farcical manner its principles. It reduces wisdom to impotence and secures the triumph of folly, ignorance, claptrap and demagogy.(۴۸)

قوم پرستی (Nationalism):

انقلابِ فرانس کے بعد یہ تو ہوا کہ عوام کے گلے سے امرا، جاگیرداروں اور بادشاہ کی وفاداری کا جوا اُتر گیا، لیکن اب افراد کی بجائے وطن سے وفاداری کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ حب الوطنی ایک نہایت دل پذیر، حسین اور ہمہ گیر تصور ہونے کے ساتھ ایک فطری جذبہ بھی ہے تاہم جب تمام انسانی قدروں کو پس پشت ڈال کر قومی مفاد کو اوّل و آخر قرار دیا جائے تو اس سے عالمی سطح پر بے چینی اور اضطراب کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ انقلاب کے بعد نپولین (Napoleon ۱۷۶۰ء-۱۸۲۱ء) چھبیس برس مختلف ممالک مثلاً جرمنی، آسٹریا اور روس وغیرہ سے ایسی جنگ میں مصروف رہا جس کا مقصد محض فرانس کی حدود کو وسیع کرنا تھا۔ گویا انقلابِ فرانس کے بعد تمام یورپی ممالک میں قومیت کے ایک ایسے تصور کو فروغ ملا جس میں فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف اپنی قوم کے لیے تھی۔ جرمن فلاسفر ہیگل (Hegal ۱۷۷۰ء-۱۸۳۱ء) قوم پرستی کے جذبے کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں کسی مملکت کی بنیاد ہی قوم پرستی کا جذبہ ہے۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی لکھتے ہیں:

> ''فرانسیسی انقلاب نے یورپ کے سارے سیاسی اور سماجی نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ ہیگل نے اس کا حل یہ سوچا کہ قوم پرستی کی بنیاد پر سیاسی تنظیم کی جائے۔''(۴۹)

تصورِ قوم پرستی نے اپنی قوم سے محبت کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام سے نفرت (Abhorance) اور عداوت (Enmity) کے جذبے کو ابھارا۔ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اور دیگر اقوام کے لیے دوہرے معیار مقرر ہوئے اور اس طرح "White supremacy" کے تصور نے جنم لیا۔ بقول مریم جمیلہ:

> The doctrine of the supremacy of the "White race" is the most important product of European nationalism.(۵۰)

ہٹلر (Adolf Hittler ۱۸۸۹ء-۱۹۴۵ء) نے جرمن قوم کو یہ کہہ کر دیگر تمام اقوام کے مدمقابل لا کھڑا کیا کہ:

> ''قوم کی نجات بین الاقوامی اخوت کے بے بنیاد نظریات میں مضمر نہیں۔ نہ ہی حبشیوں، چینیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کو ایک ہی برادری میں منسلک کر دینے سے ممکن ہے بلکہ خود قوم کو طاقتور بنانے میں پوشیدہ ہے۔''(۵۱)

یورپ میں پہلی اور دوسری جنگِ عظیم حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستانہ ذہنیت کا ہی نتیجہ تھیں۔ مریم جمیلہ رقم طراز ہے:

> Although racial prejudice has existed in many previous societies in different parts of the world, it is only within western civilization where it reached its final culmination and attained its fullest development.(۵۲)

افادیت پرستی (Utilitarianism):

انقلابِ فرانس نے جہاں سیاسی اور سماجی نظام کو نئے سرے سے مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا وہاں فکری سطح پر بھی انقلاب برپا ہوا۔ انسان نے مابعدالطبیعیاتی موضوعات کی بجائے انسان اور اُس کے ماحول اور سماج سے اُٹھنے والے مسائل اور اُن کے حل پر توجہ مرکوز کی۔ فلاسفہ اور حکماء کی سوچ کا محور و مرکز یہ ہو گیا کہ جو شے بھی انسان کی فلاح اور مفاد میں ہے وہ صحیح ہے اور اس کے علاوہ ہر نظریہ اور منصوبہ ناقابل قبول۔ گویا ردوقبول کا معیار افادی نقطہ نظر قرار پایا۔ سیاسی اور سماجی مفکرین نے یہ رائے دینی شروع کی کہ کوئی بھی سیاسی اور سماجی نظام یا نظریہ اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں جب تک اس کا اساسی مقصد و مدعا انسان کی

مادی ضروریات کی تکمیل پر منتج نہ ہو۔ اس سے یورپ میں ایک نئے دبستانِ فکر کی بنیاد پڑی جس کا نام افادیت پرستی (Utilitarianism) ہے۔اس فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں انسان دو ہی باتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ دکھ سے یا سکھ سے (Pain or pleasure) ہر سیاسی اور سماجی نظام کی یہ خوبی ہونی چاہئے کہ اُس سے انسان کو راحت و آرام ملے اور وہ کسی قسم کے مصائب و آلام سے دوچار نہ ہو۔ انگریز مفکر جیریمی بینتھم (Jeremy Bentham ۱۷۴۸ء-۱۸۲۲ء) کے سیاسی فلسفے کا بنیادی نکتہ ہی افادیت پسندی ہے۔ جیریمی بینتھم (Jeremy Bentham) کہتا ہے کہ:

> Nature has placed mankind under the governance of two sovereign masters; pain and pleasure. It is for them alone to point out what we ought to do, as well as to determine what we shall do.(۵۳)

جیریمی بینتھم (Jeremy Bentham) اصولِ افادیت پرستی کی تعریف اور وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

> By the principle of utility, is meant that principle which approves or disapproves of every action whatsoever, according to the tendency which it appears to have to augment or diminish the happiness of the party, whose interest is in question, or, what is the same thing in other words to promote or to appose that happiness. I say of every action whatsoever; and therefore not only of every action of a private individual, but of every measure of government.(۵۴)

مشہور دانشور جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill ۱۸۰۶ء-۱۸۷۳ء) نے اپنی کتاب "Utilitarianism" میں افادیت پرستی کو بحیثیت ایک اخلاقی اُصول کے پیش کیا ہے۔(۵۵) اس کے علاوہ جن مفکرین نے افادیت پسندی کا نظریہ پیش کیا، ان میں جان آسٹن (John Austin ۱۷۹۰ء - ۱۸۵۹ء) اور جرمن مفکر نٹشے (Friedrich Wilhelm Nietzsche ۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ نٹشے (Nietzsche) اپنے ایک مضمون "Human, All Too Human" میں لکھتا ہے:

> Not a few, perhaps the majority of men find it necessary, in order to retain their self-esteem and a certain uprightness in conduct, to mentally disparage and belittle all the people, they know.(۵۶)

اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کا افادیت پرست دبستانِ فکر دراصل یورپ کے اُس تصورِ قومیت کا نتیجہ ہے جس نے عالمی سطح پر نہایت گہرے اور دُوررس اثرات مرتب کیے۔ یورپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں نوآبادیاتی نظام کی جو داغ بیل ڈالی اور پھر وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا، اور اپنے ممالک میں مال و دولت کے انبار لگائے، یہ سب افادیت پرست فکر کا ہی نتیجہ تھا۔ افادی طرزِ فکر نے یورپ کو لالچی، خودغرض و خود پسند اور استعماری قوت بنا دیا جو اپنے مفاد کے حصول اور فوائد کے

لیے کسی بھی ملک یا قوم کی آزادی اور خوش حالی کو غلامی اور عسرت میں بدلنے کے لیے ہر وقت تیار ہو۔ چنانچہ اس ظالمانہ اور خودغرضانہ طرزِ فکر کے تحت بہت سے کمزور ممالک کا استحصال کیا گیا اور اُنہیں برباد کر کے اپنے مفادات حاصل کیے گئے۔ گویا یورپ کے نزدیک کمزور ممالک کی حیثیت قابل تصرف شے (Consumeable Product) کی سی ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ تیونس، مصر، شام، سوڈان انڈونیشیا، مراکش، نائجیریا، لیبیا، ترکی، گنی، گھانا، حبشہ یہاں تک کہ ایران اور پھر برصغیر پاک و ہند یورپ کی حریص نگاہوں، خودغرضانہ فطرت اور مفادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یورپ نے ان ممالک کے مال و دولت کے ذخائر کو دل کھول کر لوٹا۔ ان کی معیشت تباہ کی اور اپنی صدیوں کی بھوک مٹانے کے لیے ان ممالک کی دولت یورپ منتقل کرنا شروع کی۔ سید علی عباس جلالپوری رقم طراز ہیں کہ یورپ نے:

> ''سیر حاصل علاقوں پر تصرف حاصل کیا اور اطرافِ عالم سے زر و جواہر سے لدے ہوئے جہاز مغربی ممالک کو جانے لگے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مغرب میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔''(۵۷)

صنعتی انقلاب (Industrial Revolution)

انگلستان اٹھارویں صدی میں مسلسل صنعتی انقلاب کی جانب رواں دواں رہا اور خاص طور پر اس صدی کے آخری ربع اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ انقلاب حتمی شکل اختیار کر گیا۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب موجودہ ترقی و عظمت کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس انقلاب نے برطانیہ کو صنعتی میدان میں دوسرے یورپی ممالک پر برتری دلا دی۔ اگرچہ بعد میں صنعتی ترقی کے اثرات اور ثمرات دوسرے یورپی ممالک تک بھی پہنچ گئے تاہم اس عمل میں کم از کم پچاس سال کا عرصہ صرف ہوا۔ یورپ میں صنعتی ترقی نے سیاسی اور سماجی سطح پر دُور رس اثرات مرتب کیے۔ مشینی دور کا آغاز ہوا۔ کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ پیدائش دولت کے طریقے سراسر بدل گئے اور ذرائع پیداوار میں اضافہ اور وسعت پیدا ہوئی۔ مورخین صنعتی انقلاب کو یورپ کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل قرار دیتے ہیں۔ بقول ٹی۔ کے۔ ڈیری:

> The development of industry is perhaps the greatest change in history; it marks off clearly the last 150 years from the previous history of the world.(۵۸)

صنعتی انقلاب نے یورپ میں مال و دولت کے انبار لگا دیئے۔ نئی ایجادات سے زندگی کی سہولیات فراہم ہونے لگیں۔ ریلوے کا نظام قائم ہوا اور بقول سٹیفن بروک:

> The railways gave an essential stimulus to the industrial revolution in Europe.(۵۹)

لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہوا۔ لندن بجلی کے قمقموں سے جگمگا اُٹھا۔ لوگوں کو بہتر رہائشی سہولتیں میسر ہوئیں۔ جگہ جگہ فلک بوس عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لیے بڑی بڑی دکانیں اور سٹور قائم ہوئے اور بنکاری کا نظام وجود میں آیا، کیونکہ:

> Without the proper and timely aid of finance, industrial growth would not have been possible.(۶۰)

غرض:

> Industry brought power; industry brought a rising standard of

life; industry led to the development of a society and a kind of life in Western Europe and the new world unknown before in history.(۶۱)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگلستان میں یکا یک اتنی زیادہ دولت کہاں سے آ گئی کہ وہ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرنے اور انڈسٹری لگانے میں کامیاب ہو گیا؟ یہ سوال اس لیے اُٹھایا گیا ہے تا کہ یہ اَمر بھی تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ یورپ جس صنعتی انقلاب کو موجودہ شان و شوکت کی ابتدا قرار دیتا ہے، اس کی بنیاد ظلم و استحصال اور لوٹ کھسوٹ پر ہے۔

انگریز جب سترھویں صدی میں روزگار اور تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تو یہاں کی خوشحالی، مال و دولت اور زر و جواہرات کے ذخائر دیکھ کر ان کی نیت بدل گئی۔ چنانچہ انہوں نے تجارت کے پردے میں سیاسی گٹھ جوڑ اور درباری سازشوں کے ذریعے مقامی ریاستوں کے انتظامی اُمور میں مداخلت شروع کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اتنی طاقت حاصل کر لی کہ بالآخر مقامی حکمرانوں کے مدِ مقابل میدانِ جنگ میں عسکری حریف کی حیثیت سے سامنے آ گئے۔ سیلے (Seeley) کہتا ہے:

It seems to me to be the principal characteristic of this phase of England that she is at once commercial and warlike.(۶۲)

سیلے (Seeley) کے مطابق:

Commerce and war were inseparably entangled together, so that commerce led to war and war fostered commerce.(۶۳)

انگریزوں نے ایک ایک کر کے مقامی ریاستوں کو اپنے استعماری عزائم کا نشانہ بنایا اور یہاں کے زر و جواہر اور مال و دولت کے ذخائر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ ہندوستان کی دولت انگلستان منتقل ہونا شروع ہوئی اور اس طرح اسے وہ زرِ کثیر ہاتھ لگا جس نے انگلستان کو ایک زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل کر دیا۔ ہندوستان کے مقامی حکمران اگرچہ کمزور نہ تھے تاہم درباری سازشوں نے اُنہیں بے بس اور لاچار کر کے رکھ دیا۔ اکبرالہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

تھی شبِ تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا(۶۴)

سفارش حسین رضوی رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کی دولت نے انگلستان پہنچ کر وہاں کی مالی حالت ہی بدل دی اور اقتصادی حالت کو یہاں تک پہنچایا کہ ولایت میں صنعتی انقلاب کا رستہ کھل گیا۔''(۶۵)

باسو (B.D. Basu) لکھتا ہے:

The English came into possession of a wealthy country. Much of this wealth flowed to England in various ways, and not only made the country wealthy but added immensely to its wealth-producing capacity. The vast hoards of Bengal and the Karnatic being conveyed to England enabled her to become industrially supreme.(۶۶)

بقول باسو:

> The material origin, then, of 'Great Britain's industrial prosperity, and, therefore, in great part of her capital, must be sought in her connection with India. It has been estimated that between Plassey and Waterloo some £1,000 millions flowed from India to England.(٦٧)

یہی نہیں کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب مشرق کی دولت سے رونما ہوا بلکہ بعد میں مشینوں کی مدد سے حاصل کردہ پیداوار کی کھپت کے لیے خام مال کے حصول کے لیے بھی کمزور ممالک کو ہی منڈی کے طور پر استعمال کیا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا۔

بہر صورت انگلستان میں خصوصاً اور پورے یورپ میں عموماً صنعتی انقلاب نے جس ایک نئے فکری نظام کو راہ دی وہ سوشلزم تھا۔ اس فکر کے ابتدائی آثار اگرچہ انقلاب فرانس اور روسو (Rousseou) کی تحریروں کے ساتھ ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے تاہم انگلستان میں سرمایہ دار اور مزدور طبقہ کے معاشی تفاوت نے اس فکر کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صنعتی انقلاب نے سرمایہ دار طبقہ کو امیر سے امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا۔ متوسط طبقہ بالکل ناپید ہو گیا۔ ملکی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں تک محدود ہو گئی، اور مزدوروں کی مفلسی اور فلاکت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ولیم راجر (William Roger) کے مطابق:

> The technological triumph led to slavelike conditions of labour.(٦٨)

رسکن (Ruskin) جو آٹھ فروری ۱۸۱۹ء کو لندن میں پیدا ہوا، لکھتا ہے:

> I have seen and known too much of the struggle for life among our labouring population.(٦٩)

اور کتھ فیلنگ (Keith Feiling) کہتا ہے کہ:

> In London, indeed, the existence of the poor could hardly be considered life.(٧٠)

چونکہ معاشرہ زرعی سے صنعتی سماج کی صورت اختیار کر چکا تھا لہٰذا لوگ جوق در جوق دیہات سے شہروں کی طرف روزگار کی تلاش میں آنے لگے۔ مشینوں نے کام پہلے ہی آسان کر دیا تھا۔ شہروں میں مزدوروں کی کثرت نے سرمایہ دار کو اپنی من مانی کا پورا موقع فراہم کیا۔ معمولی اُجرت پر مزدوروں سے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام لیا جاتا۔ سرمایہ دار خاص طور پر بچوں اور خواتین کو کام پر لگاتے کیونکہ اُنہیں بڑوں اور مردوں سے کم اُجرت دینا پڑتی تھی۔ روسی مصنف گارجی سکھ نزارو (Georgishakh Nazrou) رقم طراز ہے:

> Vast wealth is concentrated in the hands of a few and the exploiting classes more and more live a parasitic life of luxury. On the other hand, exploitation of the working class tends to grow fiercer and the gulf between those who actually create all society's wealth and those who appropriate it, widens, that

is the law of capitalist accumulation.(۷۱)

اس سنگ دلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان نفرت بڑھتی گئی اور غیر منصفانہ تقسیم دولت کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اگرچہ ''متمدن اور انسان دوست انگریز مصلحین'' نے ان آوازوں کو دبانے کی پوری کوشش کی تاہم منشوری تحریک (Chorlist Movement) نے گاہے بگاہے مزدوروں کے معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کے حق میں آواز بلند کی اور اس میں قابل قدر کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ شخص جس نے سب سے پہلے مزدوروں کے معاشی مفاد کے حصول اور اُن کی حالت کو سدھارنے کے لیے انہیں متحد و منظم ہونے کی دعوت دی وہ جرمن مفکر کارل مارکس (Karl Heinrich Marx ۱۸۱۸ء-۱۸۸۳ء) تھا۔ بقول ڈیوڈ تھامسن:

> Early socialist movements could never find roots or room in Europe. It was only when socialist theory had been transformed at the hands of state socialists like Louis Blanc and of more scientific economic theorists like Karl Marx that it could accommodate itself to the necessities of life in the increasingly industrialized nations of Europe.(۷۲)

کارل مارکس (Karl Marx) نے کہا کہ انسان کی بنیادی ضرورت خود زندہ رہنا اور اپنی نسل کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے۔ زندگی برقرار رکھنے کے لیے صرف غذا ہی نہیں بلکہ دیگر مادی ضروریات بھی درکار ہیں جو غذا کا ہی درجہ رکھتی ہیں۔ اشیا اور غذا کی پیداوار کا اصل سبب مزدور اور کسان ہیں جبکہ اُنہیں پیداوار کے منافع سے کچھ بھی حصہ نہیں ملتا جبکہ سرمایہ دار ہر طرح کے فوائد حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ کارل مارکس (Karl Marx) نے یہ تجویز دی کہ بجائے اس کے کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں سمٹ آئے، پوری قوم کو اس کا حصے دار بننا چاہئے۔ اسی طرح معاشی مساوات قائم ہو سکتی ہے۔ دراصل سوشلزم کی تحریک مزدور طبقہ کے حقوق کے تحفظ اور اُن کا کھویا ہوا معاشرتی وقار بحال کرنے کے لیے تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس طبقہ کے پاس بہت سرمایہ ہے اُن سے سرمایہ اُن ہاتھوں میں منتقل ہو جن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ پروفیسر صلاح الدین رقم طراز ہیں:

> In fact, the socialist movements tended to snatch the rights from the 'hane' and bestow them on the 'hane nots'. The basic concept of the leaders was that the labourers were the real creators of national wealth.(۷۳)

یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ سوشلزم صرف معاشی تصور ہی نہیں بلکہ ایک فلسفہ حیات ہے جس کے نزدیک کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے اور روحانی قدروں کی بجائے مادی ضروریات کا حصول اور اُن کی تکمیل ہی کسی سماج کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اگرچہ کارل مارکس کا معاشی مساوات کا نظریہ بہت مقبول ہوا اور اس نے اُنیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کے فکر و عمل میں ایک انقلاب برپا کر دیا تاہم معاشی مساوات کے اصول کی بنیاد انسانی صلاحیتوں کے تنوع کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بہت بڑی ناانصافی پر ہے۔ معاشی مساوات کا نظریہ انسان میں تگ و دو کرنے، جدوجہد اور محنت کرنے کا جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ عدل کے تقاضوں کی تکذیب اور انسانی صلاحیتوں کے نکھرنے، سنورنے اور جلا پانے کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

سوشلزم کی یہ ایک بہت بڑی اور بنیادی خامی ہے کہ اس نظام کے تحت انسان ایک مشین کے پرزے کی صورت

اختیار کر لیتا ہے اور اُس میں ابداع و اختراع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ موجودہ دور میں سوویت یونین کا جس طرح شیرازہ بکھرا، یہ اس نظام کی واضح ناکامی کی دلیل ہے۔

یورپ میں اُنیسویں صدی اپنے جلو میں صنعتی انقلاب کے ثمرات اور سوشلزم کے اثرات لے کر طلوع ہوئی۔ صنعتی انقلاب نے انگلستان میں مادی وسائل فراہم کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ٹکنالوجی کی ترقی سے معاشرے کو بے پناہ سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہوئیں۔ مادی وسائل کی بہتات نے انسان کو دولت کا پجاری اور غلام بنا کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ انسان کی فکر اور سوچ پر مادیت نے ایسا غلبہ ڈالا کہ روحانی اور مذہبی اقدار سے اُس کا اعتقاد جاتا رہا اور آئندہ تمام افکار و نظریات کی اساس عقلی و مادی توجیہات پر رکھی گئی۔

چارلس ڈارون (Charles Darwin ۱۸۸۲ء-۱۸۰۹ء) کو مادہ پرستانہ سوچ کا نمائندہ مفکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقا (Evolution Theory) کو اُنیسویں صدی میں یورپ کی عقلی و مادی طرزِ فکر کا سب سے بڑا تحفہ قرار دیا جاتا ہے۔ ڈارون کی کتاب (On the Origin of Species) ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب نے فکری دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ڈارون نے کہا کہ ہر جاندار کے جسم اور شکل و شباہت میں مسلسل خفیف تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ایک طویل مدت کے بعد ان تبدیلیوں کے جمع ہونے سے ایک نیا جاندار معرضِ وجود میں آ جاتا ہے۔ اگر اس جاندار کی نسل جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے جہد للبقا (Struggle for Existence) کے دوران اپنے ماحول کی مشکلات کے ساتھ کامیاب مقابلہ کر سکے تو وہ زندہ رہتی ہے ورنہ مٹ جاتی ہے۔ (Survival of the Fittest)

ڈارون (Darwin) کے خیال میں زندگی اپنے ظہور کے بعد مسلسل ارتقا پذیر ہے اور اس وجہ سے مختلف حیوانات کے وجود بنتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اسی ارتقا کے نتیجہ کے طور پر روئے زمین پر نوع بشر کا ظہور ہوا۔ گویا انسان مختلف حیوانی ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور کائنات کی تخلیق میں اس کے عمل دخل سے یکسر انکار کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کو شرف و فضیلت کے مرتبے سے گرا کر حیوانات کی صف میں لا کھڑا کیا۔

نظریہ ارتقا نے اُنیسویں صدی کے افکار و نظریات پر گہرے اثرات مرتب کیے اور یورپ کی فکری دنیا میں اس نے لامذہبیت اور دہریت کا جو بیج بویا اس کا نتیجہ ایک بار آور درخت کی صورت میں نمودار ہوا۔ ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer ۱۸۲۰ء-۱۹۰۳ء) کا معاشرتی ارتقا کا فلسفہ اگرچہ ایک الگ نظریہ ہے تاہم بقول پروفیسر سی۔ اے۔ قادر ''اسپنسر کے معاشرتی فلسفہ کا بنیادی پتھر نظریہ ارتقا ہی ہے۔'' (۷۴)

ہکسلے (Thomas Henry Husclay ۱۸۲۵ء-۱۸۹۵ء) جو ڈارون کے نظریات کا بہت بڑا حامی اور مداح ہے اُس نے ایک مرتبہ یہاں تک کہا کہ ''اگر بندر انسان کا جدِ امجد ہے تو اس پر شرمانے کی کوئی وجہ نہیں۔'' (۷۵) میگڈوگل نے اپنی کتاب ''سوشل سائیکالوجی'' میں اپنا نظریہ جبلت پیش کیا ہے:

> ''انسان ایک حیوان ہے جس کا کوئی فعل ایسا نہیں جو اس کی کسی نہ کسی جبلت کے منبع سے سرزد نہ ہوتا ہو۔ جب تک انسان کو کوئی جبلت نہ اُکسائے، وہ نہ کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کام کے متعلق سوچ سکتا ہے۔'' (۷۶)

گویا اگر انسان کی سرشت میں ایسی قوتیں موجود ہیں جنہیں عقل اور ارادہ کہا جاتا ہے تو وہ اُس وقت تک بے فائدہ اور بیکار رہتی ہیں جب تک کوئی جبلی خواہش اُنہیں اپنی تسکین اور تشفی کے لیے کام میں نہ لائے۔ نیک و بد میں تمیز کرنے اور برائی سے رکنے کے لیے عقل و ارادہ کا ہونا ضروری ہے لیکن میگڈوگل کے نظریۂ جبلت کے مطابق عقل و ارادہ بیکار ہیں جب تک جبلت اسے عمل کی اجازت نہ دے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق انسان فقط ایک ترقی یافتہ ذہن رکھنے والا حیوان ثابت ہوتا ہے جو اپنی بہتر

دماغی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود حیوانی جبلت کے حصار سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud ۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) تمام انسانی سرگرمیوں میں جنسی جذبہ کو حاوی قرار دیتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انسان کے لاشعور میں جنسی خواہشات کا ایک طوفان ہے اور لاشعور ہر لحظہ شعور سے ان خواہشات کے پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن ان خواہشات کی تکمیل کی راہ میں مذہب و اخلاق سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ فرائڈ (Freud) کے نزدیک انسان ایک شہوانی حیوان ہے جب اس کی جنسی خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو وہ مختلف عوارض اور امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح فرائڈ (Freud) نے یورپ کو آزاد جنسی اختلاط کی راہ سجھائی، جس نے آگے چل کر عورت کو جنسِ بازار بنا کر رکھ دیا۔ عورت کی برہنگی سے جنسی اشتہار بازی (Modelling) کا کام لیا جانے لگا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کی حیثیت معاشرے میں محض جنسی محرک برائے فروخت اشیا (Products Selling Product) ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

> ''دانتوں کا برش مرد بھی استعمال کرتے ہیں اور عورتیں بھی مگر اشتہار پر صرف عورت۔ بلیڈ جہاں تک مجھے معلوم ہے مردوں کے استعمال کی چیز ہے مگر اس کے فلیپ پر عورت۔ دنگل کے اشتہاروں پر عورت اور مٹھائی کے اشتہاروں پر تو عورت کو ہونا ہی چاہئے..... حد سے زیادہ جنسی ترغیب و تحریص یورپ کا وہ تحفہ ہے جس کی آج کل بڑی مانگ ہے۔''(۷۷)

اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں صنعتی انقلاب کے بعد جس مادی طرزِ فکر کے حامل معاشرے کا ظہور ہوا، اُس نے آئندہ ساری اُنیسویں صدی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین:

> ''اُنیسویں صدی میں سائنس دانوں کے اس عقیدے کی وجہ سے کہ کائنات میں فقط مادہ ہی ایک حقیقی چیز ہے علمی حلقوں میں مذہب اور روحانیت کے خلاف ایک زبردست جذبہ کارفرما ہو گیا تھا۔''(۷۸)

مغرب کے تہذیبی، سیاسی اور فکری پس منظر کے اجمالی جائزہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جوع الارض، ہوسِ زر، خود غرضی، جنسی بے راہ روی، روحانی قدروں سے فرار، مطالعہ کائنات و فطرت کا شوق اور سائنسی قوانین اخذ کرنے سے متعلق الحادی نقطۂ نظر تہذیبِ مغرب کے وہ عناصر ترکیبی ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ بحوالہ: برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر، ''یورپ پر اسلام کے احسان''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۷۶-۷۷

۲۔ Briffault, Dr., Robert, "The Making Of Humanity", Islamic Book Foundation, Lahore, 1991, P:294.

۳۔ Fergusan, Wallace K., " A Survey Of Europeon Civilization",Houghton Mifflin Company, Boston, 1958, P:491.

۴۔ ایشیا سٹریٹ، ''انگلستان''، مترجم: علی ناصر زیدی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۰

۵۔ Draper, Jahn William, "History Of The Intellectual Development Of Europe", Vol:II,George Bell & Sons, London, 1896, P:

۶۔ بحوالہ: برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر، ''یورپ پر اسلام کے احسان''، ص ۷۵-۷۶

۷۔ مصطفیٰ السباعی، ڈاکٹر، ''اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو''، مترجم: سید معروف شاہ شیرازی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور،

۱۹۸۰ء،ص۱۵

۸۔ عنایت اللہ سبحانی، ''مجاہد کی اذان''، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۳۷۳

۹۔ گرانٹ اے، جے، ''تاریخ یورپ''، بحوالہ: ''لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر''، از مولانا محمد تقی امینی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۴۳

۱۰۔ Briffault, Dr., Robert, "The Making Of Humanity", P:206.

۱۱۔ Bertrand Russel, "In Praise Of Idleness", Unwin Books, City & Year Not Mentioned, P:101.

۱۲۔ ثاقب رزمی، ''سائنسی فکر اور ہم عصر زندگی''، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۷

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ Nadawi, Abual Hasan Ali, "Islam & The World" Translated by M.Asif Kidwai, Sh.Muhammad Ashraf, Lahore, 1966,P:126-27

۱۵۔ Draper, Jahn William, "History Of The Intellectual Development Of Europe", Vol:II, P: 256

۱۶۔ Bertrand Russel, "History Of Weatern Philosophy",George Allen Unwin L.T.D London, 1946, P:551.

۱۷۔ Fergusan, Wallace K., " A Survey Of Europeon Civilization", P:478.

۱۸۔ ہرمل رینڈل، جان جونیئر، ''ذہن انسانی کا ارتقا''، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص۲۵۹

۱۹۔ بحوالہ: ول ڈیورنٹ، ''داستانِ فلسفہ''، مترجم: سید عابد علی عابد، مکتبہ اُردو لاہور، ۱۹۳۳ء، ص۲۲۰-۲۲۱

۲۰۔ Bertrand Russel, "History Of Weatern Philosophy", P:564.

۲۱۔ Ibid, P:535.

۲۲۔ ایڈون اے برٹ، ''فلسفہ مذہب''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۱۶۲

۲۳۔ Ferdinand Schenill, "A History of Europe", Hascourt Brance And Company, New York, 1951,P:362.

۲۴۔ ہرمل رینڈل، جان جونیئر، ''ذہن انسانی کا ارتقاء''، ص۲۶۸

۲۵۔ محمد اقبال، ''کلیات اقبال (اردو)''، ص۱۶۴/۱۶۴

۲۶۔ Bertrand Russel, "History Of Weatern Philosophy", P:587.

۲۷۔ Ibid.

۲۸۔ Ibid.

۲۹۔ بحوالہ: محمد حسن عسکری، ''جدیدیت''، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۴۵

۳۰۔ ایضاً، ص۴۶

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ڈاونز، رابرٹ بی، ''کتابیں جنہوں نے دُنیا بدل ڈالی''، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص۲۵۲

۳۳۔ ہرمل رینڈل، جان جونیئر، ''ذہن انسانی کا ارتقاء''، ص ۲۸۶

۳۴۔ Draper, Jahn William, "History Of The Intellectual Development Of Europe", Vol:II, P: 280.

۳۵۔ Bertrand Russel, "History Of Weatern Philosophy", P:587.

۳۶۔ محمد اقبال، ''کلیات اقبال (اردو)''، ص ۱۶۴/۱۶۴

۳۷۔ Briffault, Dr., Robert, "The Making Of Humanity", P:224.

۳۸۔ بحوالہ: محمد تقی امینی، مولانا، ''لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر''، ص ۴۹

۳۹۔ نکولومیکیاولی، ''بادشاہ''، مترجم: محمود حسین، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۵۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۹۰

۴۱۔ Raghubir Dayal, "Modern European History", C.B.S Publishers & Distributers, Delhi, 1991, P:52.

۴۲۔ Vivian Ridler, " Fifteen Poets, The Engilsh Language Book Society, Oxford University Press, 1968, P:232.

۴۳۔ Raghubir Dayal, "Modern European History", P:51.

۴۴۔ Mohagen V.D., " History Of Modern Europe Since 1789"S.Chand & Company Ltd, New Delhi, 1990, P:31.

۴۵۔ Ibid, P:32.

۴۶۔ Charlton D.G., " France" A Companion To French Studies, Methuen, London,1979, P:257.

۴۷۔ Mohagen V.D., " History Of Modern Europe", P:157.

۴۸۔ Briffault, Dr., Robert, "The Making Of Humanity", P:295.

۴۹۔ محمد ہاشم قدوائی، ''یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین''، اقبال پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۲۲۴

۵۰۔ Meryam Jameela, "Western Civilization Condemned by Itself"Vol:I, Muhammad Yousaf Khan & Sons, Lahore, 1970, P:91.

۵۱۔ اڈولف ہٹلر، ''تزک ہٹلری'' (حصہ اول)، مترجم: مولوی محمد ابراہیم چشتی، لائن پریس، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۴۸۶

۵۲۔ Meryam Jameela, "Western Civilization Condemned by Itself", P:91.

۵۳۔ Jeremy Betham, "The Principle Of Unity, With Ref., Crane Brinton", The Fate Of Man", George Braziller, New York, 1961, P: 161.

۵۴۔ Ibid, P: 162.

۵۵۔ ہیرلڈ ہوفڈنگ، ڈاکٹر، '' تاریخ فلسفہء جدید'' (جلد دوم)، مترجم: خلیفہ عبدالحکیم، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۴ء، ص ۴۶۷

۵۶۔ Nietzshe, Friedrick Wilhelm, "Human All Too Human" With Ref., " The Fate

of Man By Crane Briton, P: 240.

۵۷۔ علی عباس جلال پوری، سید، ''روحِ عصر''، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۲

۵۸۔ Derry T.K., "The Europen World", G.Bell & Sons, Ltd, London, 1951, P: 25.

۵۹۔ Stephen Brooks, " Ninteenth Century Europe", Mecmillans, London, 1984, P:78.

۶۰۔ Raghubir Dayal, "Modern European History", P:46.

۶۱۔ Derry T.K., "The European World", P: 38.

۶۲۔ Seely, J.R., "The Expansion Of England", Mecmillans And Co. Ltd. London, 1912, P:109.

۶۳۔ Ibid, P:111.

۶۴۔ اکبرالہ آبادی، ''کلیات اکبر''، ص ۲۴

۶۵۔ سفارش حسین رضوی، ''ہماری تہذیبی میراث''، نیشنل پرنٹرز، نئی دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۲۳

۶۶۔ Basu., B.D., "The Ruin Of Indian Trade Anad Industries", R., Chatterjee, Calcutta, P:138.

۶۷۔ Ibid, P:140.

۶۸۔ Roger Williams, "Modern Europe", St, Mastin Press, New York, 1964,P:217.

۶۹۔ Ruskin, " Crown Of Wild Olive", Kitab Mahal, Lahore, P:17

۷۰۔ Keith Feiling., "A History Of England", Mecmillan, London, 1966, P:691.

۷۱۔ Georgi Shakhnazarov., "Man Science And Society", Translated By Jim Riorden, Progress Publishers, Mascow,1965, P:78.

۷۲۔ David Thomson., "Europe Since Napoleon", Penguin Books, Middlsex,1970, P:125.

۷۳۔ Salah-ud-Din, Prof., "A Simple History Of Modern Europe", Aziz Publishers, Lahore, 1987, P:58.

۷۴۔ سی اے قادر، ڈاکٹر ''معاشرتی نظریے''، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۸

۷۵۔ رابرٹ بی، ڈاونز، ''کتابیں جنہوں نے دُنیا بدل ڈالی''، مترجم: مولانا غلام رسول مہر، ص ۲۲۹

۷۶۔ بحوالہ: محمد رفیع الدین، ڈاکٹر، ''قرآن اور علم جدید یعنی احیائے حکمت دین''، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸

۷۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''پاکستان تعبیر و تعمیر''، مکتبہ خیابانِ ادب، ۲۹-چیمبرلین روڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۸

۷۸۔ محمد رفیع الدین، ڈاکٹر، ''قرآن اور علم جدید یعنی احیائے حکمت دین''، ص ۱۳۷